

# ماہر القادری

Tweet

دنیاۓ ادب میں بحیثیت شاعر، ادیب، محقق اور صحافی نصف صدی سے زائد عرصہ گزارنے والے ماہر القادری سن 1324 ہجری میں پیدا ہوئے۔ ان کا اصل نام منظور حسین تھا۔ جائے پیدائش کسیر کلاں ضلع بلند شہر ہے۔ زندگی کا بڑا حصہ حیدرآباد دکن، دہلی، بمبئی میں گزرا اور پھر مستقل قیام کراچی میں رہا۔ چند ماہ ملتان



میں بھی گزارے۔ اس کے علاوہ سیر و سیاحت کا بارہا اتفاق ہوا۔

ہندوستان میں اتنے مشاعرے پڑھے کہ دوسروں کو کم ہی میسر آئے ہوں گے۔ خود لکھتے ہیں ”بعض اوقات ایک ایک ماہ کا سلسلہ سفر رہا ہے۔ شام مدراس میں ہوئی چوتھی صبح سوادِ بنگال میں طلوع ہوئی“ (بحوالہ میری کہانی، میری زبانی۔ فاران، ماہر القادری نمبر دسمبر 1978ء)۔ چوتھی صبح اس لیے کہ اس دور میں ہوائی سفر عام نہ تھا۔

1928ء میں حیدرآباد دکن گئے۔ مہاراجا کشن پرشاد کی قدر شناسی کی بنا پر کئی سال وہاں رہے۔ یہ عرصہ تقریباً پندرہ سال کا رہا۔ اس دوران دکن کے مختلف محکموں میں کام

کرنے کا موقع ملا۔ قیام حیدرآباد کے دوران میں جب نواب بہادر یار جنگ کی تقاریر کا طوطی بولتا تھا، نواب صاحب نے قائد اعظم سے ان کا تعارف یوں کرایا ”میری تقریروں اور ان (ماہر القادری) کی نظموں نے مسلمانانِ دکن میں بیداری پیدا کی ہے۔“

1943ء میں حیدرآباد سے بمبئی منتقل ہو گئے۔ وہاں فلمی دنیا میں کچھ عرصہ گزارا۔ کئی فلموں کے گانے لکھے جو بڑے مقبول ہوئے۔ مولانا ماہر کی فلمی زندگی پر مختلف اخبارات اور رسائل کے مدیر عبدالکریم عابد کا تبصرہ بھی دیکھتے چلیں۔ وہ لکھتے ہیں ”ماہر صاحب بمبئی کی فلمی دنیا سے بھی وابستہ رہے اور فلمی گیت بھی لکھے۔ اس زمانے میں وہ ایک جوان رعنا تھے اور بمبئی کی ایکٹریسوں میں ان کی حسین صورت اور حسن سیرت کا بڑا چرچا تھا اور محفلوں میں وہ باتھوں ہاتھ لیے جاتے تھے۔ نرگس کی والدہ جدن بائی ان پر بڑی ’مہربان‘ تھیں۔ (بحوالہ ”سفر آدھی صدی کا۔“)

اپنے فلمی تعلق پر وہ کبھی نازاں نہ رہے۔ اس پر ان کا تبصرہ ان کے الفاظ میں سنیے ”چند دن فلمی دنیا سے بھی تعلق رہا۔ فلمی دنیا میں میرے لیے شہرت اور جلب منفعت کے بعض زرّیں مواقع حاصل تھے، مگر اللہ کا بڑا فضل ہوا کہ میں اس دلدل سے بہت جلد نکل آیا۔ اس چند روزہ فلمی تعلق پر آج تک متاسّف ہوں۔“ (میری کہانی، میری زبانی۔ فاران ماہر القادری نمبر، دسمبر 1978ء)

مولانا ماہر القادری نے کراچی آکر رسالہ فاران کا اجرا کیا جو ان کی وفات کے کچھ عرصہ بعد تک جاری رہا۔

لندن میں مقیم شاعر ساقی فاروقی اپنی سوانح ”آپ بیتی۔ پاپ بیتی“ میں لکھتے ہیں:

سمورا میکہ ہو یا سسرال

موہے دونوں طرف کا ہے خیال

یہ مولانا ماہر القادری کے ایک گیت کے بول ہیں جو انہوں نے محبوب کی فلم ’تقدیر‘ کے لیے لکھے تھے۔ ساقی فاروقی نے اپنی کتاب میں کافی کچھ خرافات اور ہذیان لکھا ہے (جس کے باعث اسے ’وہبی وہانوی‘ کا درجہ دیا جاسکتا ہے) لیکن یہ سب ہمارے موضوع سے الگ ہے۔ تاہم انہوں نے مولانا ماہر القادری کے بارے میں جو مزید لکھا ہے وہ کچھ یوں ہے ”اس زمانے میں وہ جدن بائی کے ہاں رہتے تھے اور ان کی بیٹی نرگس پر لٹو تھے۔ پاکستان آنے کے بعد جماعت اسلامی میں شامل ہو گئے۔ خوش خوراک تھے۔ جدہ جاکر جان، جان آفرین یعنی قورمے بریانی کے حوالے کردی۔“ ساقی فاروقی نے کسی بات کا حوالہ نہیں دیا کہ یہ معلومات انہیں کہاں سے حاصل ہوئیں، نہ ہی یہ بیان کیا ہے کہ

ان کی ماہر القادری سے کوئی ملاقات ہوئی بھی تھی یا انہوں نے سب اپنے گھٹیا تخیل سے گھڑ کر لکھ دی ہے۔ پوری کتاب میں ماہر القادری کا تذکرہ ان تین سطروں میں کیا ہے اور وہ بھی سیاق و سباق سے الگ ہو کر۔ اس کے علاوہ ان کا تذکرہ اور کہیں نہیں ہے۔ ماہر صاحب جدن بائی کے یہاں بقول خود رہتے ضرور تھے اور صرف وہ ہی نہیں شاعروں اور ادیبوں کی فوج کی میزبانی وہ کرتی تھی لیکن نرگس پر لٹو ہونا کسی نے نہیں لکھا۔ جدن بائی کی شاعری کے شوق و انہماک پر احسان دانش نے اپنی سوانح ’جہانِ دانش‘ میں تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔

اس کے علاوہ اپنی کتاب ”گنجے فرشتے“ مینمنٹونے نرگس کے خاکے میں جدن بائی کا ذکر کیا ہے کہ اسے شاعری سے بہت لگاؤ تھا اور بھٹی میں اکثر شعرا اسے اپنا کلام سنانے جاتے تھے۔ وہ منٹو کے افسانوں کی بھی مدّاح تھی۔

مولانا کی اپنی تحریر کے مطابق وہ رشتہ ازدواج میں 1925ء میں بندھ گئے۔ اس وقت تک نرگس پیدا بھی نہیں ہوئی تھی۔ ہاں البتہ اس کی ماں یعنی جدن بائی سے ان کی رفاقت کی داستان زبان زد عام تھی، اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ اس

تحریک کی ابتدا اس خاتون کی طرف سے ہوئی تھی ، گویا ”عشق اول در دلِ معشوق پیدا می شود۔“ اس خاکسار کو ان سے کئی مرتبہ نیاز حاصل کرنے کا موقع ملا ۔ 1971ء سے 1977ء تک کے دورانیہ میں معروف شاعر اعجاز رحمانی کی معرفت یہ ملاقاتیں رہیں ۔ اس دوران جدن بائی کا تذکرہ بار بار آیا۔ مولانا سے ہم نے ایک سوال بھی کیا ”سنا ہے کہ جدن بائی آپ پر فدا تھی۔“ مولانا نے اپنی شگفتہ مزاجی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس گستاخی کو نظر انداز کیا اور ایک قہقہے میں بات اُڑادی ۔

اب ہم ساقی فاروقی کی تحریر کے دوسرے نکتے کی طرف آتے ہیں۔۔ ”پاکستان آکر جماعت اسلامی میں شامل ہو گئے“ ماہر صاحب کبھی بھی جماعت اسلامی میں شامل نہیں ہوئے ، ہاں ان کی ہمدردی اور تائید جماعت کو حاصل تھی ۔ مولانا مودودیؒ سے ان کے دوستانہ تعلقات مرتے دم تک رہے۔ اس تعلق کی وضاحت انہوں نے خود کی ہے ”میں جماعت اسلامی کا صرف ہمدرد ہوں ، اس تنظیم سے میرا کارکن کی حیثیت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔“ (ماہنامہ فاران ۔ اگست 1962ء)

تیسرا نکتہ ہے وہ خوش خوراک تھے ، نہ معلوم ان کی خوراک کی مقدار سے ساقی فاروقی کو اتنی دلچسپی کیوں پیدا ہوئی کہ تضحیک آمیز الفاظ میں اس کا ذکر ضروری سمجھا گیا۔ مولانا اگر خوش خوراک تھے تو بھی انہوں نے دوسروں کے مانگے تانگے پر گزر نہیں کی۔ ساقی فاروقی کی طرح کبھی مبین الحق صدیقی کے ساتھ یا کسی اور کے ساتھ جعل سازی نہیں کی۔ فاروقی صاحب نے خود اپنی کتاب میں اس جعل سازی کا ذکر کیا ہے اور یہ بھی کہ کالج کی فیس کے نام پر صدیقی صاحب کے دیے ہوئے دو سو روپوں کو

شراب خانے میں شرابی دوستوں کے ساتھ مزے اڑانے پر صرف کیا۔ برسبیلِ تذکرہ ، ماہر صاحب سے برسوں کے دوستانہ مراسم رکھنے والے عبدالکریم عابد کی مذکورہ کتاب کا ایک حوالہ درج کرتے ہیں۔ ”کھانے پینے کے معاملے میں ماہر صاحب پیٹو تو نہیں تھے لیکن چٹوڑے مزاج کے ضرور تھے ، راستے پر چلتے ہوئے بھی کہیں کباب یا کھیر وغیرہ کی دکان دیکھ لیتے ، تو جی للچا جاتا تھا۔“ ماہر صاحب خوش خوراک نہینخوش ذائقہ رکھنے والے فرد تھے اور میزبان کے حسن ترتیب اور کھانے کی لذت کا ذکر کرتے ۔

ایک واقعے کے ہم شاہد ہیں۔ غالباً 1975ء کی بات ہے ایک مختصر سی نشست ترتیب دی گئی جس میں اعجاز رحمانی ، امید فاضلی اور ماہر صاحب شریک تھے ، مہمانوں کی ضیافت کی گئی ۔ نشست کے اختتام پر کھانے کی تعریف کی ، اس کے بعد جب بھی سامنا ہوتا ، اس شب کے کھانے کی تعریف کرنا نہ بھولتے ۔ ہمارے خیال میں اس میں ان کے حسنِ اخلاق کا زیادہ دخل تھا ۔

عبدالکریم عا بد نے ماہر صاحب کو ان الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا ہے۔  
 ”ماہر صاحب اچھے شاعر ہونے کے ساتھ ایک اچھے انسان بھی تھے۔ ہر ایک سے  
 ہمدردی اور سب کے ساتھ محبت سے پیش آنا ان کا وتیرہ تھا۔ اگرچہ وہ اپنے عقائد  
 اور خیالات میں بہت متشدد تھے اور بڑے متشرع بھی تھے، لیکن زاہد خشک

نہیں تھے ، جس محفل میں ہوتے اسے باغ و بہار بنا دیتے۔ ان کی بذلہ سنجی اور ان کا مسکراتا چہرہ آج بھی ان کی یاد دلاتا ہے۔“

ماہر صاحب کی پرلطف باتوں کا تذکرہ پروفیسر خورشید احمد نے اپنی کتاب تذکرہ زنداں میں کیا ہے ”ماہر صاحب ارادی طور پر ایسے پیارے ترجمے کرتے ہیں کہ طبیعت خوش ہوجائے۔ ایک دفعہ فرمانے لگے کہ تم نے (Little sea) میں میری غزل سنی ہے ! سب چکرا گئے۔ معلوم ہوا کہ ”چھوٹی بحر“ میں ! جگر صاحب نے ایک بار ماہر صاحب سے کہا کہ تمہارے ترجموں کی بڑی دھوم ہے ذرا ’زندہ باد‘ کا ترجمہ تو کرو۔ کہنے لگے کیا دلوائو گے۔ پانچ روپے معاملہ طے ہوا۔ تھوڑی دیر میں تشریف لائے کہ روپے

نکالو۔ جب روپے نکلوا لیے تب سنایا ’Live wind‘ جگر صاحب کی بھی باچھیں کھل گئیں۔ شوکت تھانوی مرحوم کسی کو نہ چھوڑتے تھے۔ ماہر صاحب سے ان کی نوک جھونک خوب چلتی تھی ، لیکن ماہر صاحب نے بھی ان کے نام پر وہ ہاتھ صاف کیا کہ ’رہ گئے وہ بھی ہاں کرتے کرتے‘ کہا تم تو Grandeur of police station ہو۔ پروفیسر خورشید مزید لکھتے ہیں ’مولانا مودودی کو میں نے جب یہ ترجمہ سنایا ، تو ہنسنے اور برجستہ فرمایا ”واہ واہ ماہر صاحب تو بالکل ہی (Expert of Al-Mighty)، (ماہرالقادری) نکلے۔“ یہ 1964ء کی نظر بندی کا واقعہ ہے جب جماعت اسلامی کی پوری مجلس شوریٰ (تقریباً پچاس افراد) جیل میں تھی۔

ماہر صاحب نے روزنامہ ”مدینہ“ کی ادارت سے وابستگی کا ذکر کرتے ہوئے بیان کیا کہ ایک خبر تھی ، جس کی سرخی انہوں نے قائم کی تھی۔ ”بنگال میں گورنر نے ریڈیو کا انتظام کر دیا۔“ کاتب صاحب نے اس سرخی کو اس طرح لکھا ”بنگال میں گورنر نے رنڈیوں کا انتظام کر دیا۔“ مزید لکھا ”وہ تو خیر ہوئی کہ کتابت کی اس غلطی پر میری نظر پڑ گئی ورنہ اسی طرح خبر چھپ جاتی۔“

ان کی شگفتہ مزاجی کا ایک قصہ سنتے چلیں۔ جنرل اعظم ان دنوں مشرقی پاکستان کے گورنر تھے (یہ غالباً 1958ء کے مارشل لا کا ذکر ہے)۔ گلستان ڈھاکہ کا مشہور سنیما ہے۔ اسی میں مشاعرہ منعقد ہوا۔ جنرل موصوف نے بھی شرکت فرمائی۔ کسی شاعر کو اس کے شعر پر زیادہ داد ملتی تو وہ غالباً اپنی گوش گزاری کے سبب اپنی بیگم صاحبہ سے کچھ پوچھتے۔ ارم لکھنوی نے اپنی غزل کا مطلع پڑھا :

سموہ یہ کہتے ہیں کہ جا اب رستگاری ہو گئی

اے جنوں! زنجیر یہ تو اور بہاری ہو گئی

تو ہال تحسین کے شور سے گونج اٹھا۔ اس پر جنرل صاحب نے اپنی بیگم صاحبہ سے سرگوشی کے انداز میں کچھ دریافت کیا۔ جب مشاعرے سے ہم قیام گاہ پر آئے ، تو میں نے کہا ارم صاحب آپ نے غضب کر دیا۔ مارشل لا کے دور میں ایسا

سیاسی مطلع پڑھ دیا۔ وہ چونک کر بولے اس مطلع کو سیاست سے کیا واسطہ! اور یہ غزل تو میں نے تقسیم سے قبل انگریز کے دور حکومت میں لکھنو میں کہی تھی۔ اس مذاق میں اقبال صفی پوری کی شوخی اور ظرافت نے اور لطف پیدا کر دیا اور ارم صاحب کو باور کرایا کہ یہ شعر اے

حلقوں میں موضوع بحث بنا ہوا ہے۔ معاملہ بڑا سنگین نظر آتا ہے اور بھیّا ارم! ہم جانتے ہیں کہ تمہارا سیاست سے دور کا بھی واسطہ نہیں رہا، مگر۔۔۔۔۔ یہ زنجیر۔۔۔۔۔ اور بھاری ہو گئی۔ اس کی توجیہ تو ہماری سمجھ میں بھی نہیں آتی۔ اس شعر کو یہ معنی پہنائے جارہے ہیں کہ پچھلے دوروں کے مقابلہ میں موجودہ دور سخت تر ہے۔ ارم بے چارے کے چہرے پر فکر و تشویش کی ہوائیاں سی چھوٹنے لگیں۔ کئی دن مذاق کا سلسلہ چلتا رہا اور جب اس مذاق کا راز ان پر کھل گیا، تو برا نہیں مانا۔ (فاران مارچ 1967ء)

ماہر صاحب کی ایک بڑی خوبی اپنی کمزوریوں کا اعتراف کرنا بھی تھا۔ یہ عملی زندگی میں ہوں یا ادبی زندگی میں۔ اس معاملے میں وہ کسی بخل کا مظاہرہ نہ کرتے۔ ان کی یاد

میں لکھے گئے مضمون میں لالہ صحرائی ایک اجتماع میں ان سے ملاقات کا حال لکھتے ہیں ”انہوں نے بڑے تپاک کے ساتھ مجھ سے معانقہ فرمایا پھر بڑی محبت کے ساتھ مجھے اپنے بستر پر بٹھایا، اب ان کے چہرے پر ایک چھوٹی سی ڈاڑھی بھی آگ آئی تھی جو آنکھوں کو بڑی بھلی لگ رہی تھی۔ میں نے ڈاڑھی کی مبارکباد پیش کی تو آپسٹہ سے بولے آپ کی مبارکباد کا شکریہ تاہم مجھے اس بات کی ندامت ہے کہ زندگی کا ایک بڑا عرصہ تارک سنت بن کر گزرا۔“ (فاران۔ ماہر القادری نمبر)

خود شاعر ہونے کے باوجود شاعروں کے متعلق ان کا مشاہدہ نوٹ کرتے چلیں ”شاعر کتنا ہی پارسا اور صاحبِ تقویٰ کیوں نہ ہو رنگین مزاج بھی ہوتا ہے۔“

اسے ہم ان کی حقیقت پسندی کہہ سکتے ہیں۔ (ماہنامہ فاران، مارچ 1967ء)

ماہر صاحب کو اپنے ساتھیوں کے کسی شعر میں نقص نظر آتا، تو نشاندہی کر دیتے۔ اس کے ساتھ اگر کسی معمولی سی تبدیلی سے شعر کا حسن دوبالا ہو جاتا تو اس کے گوش گزار کر دیتے۔ اسی طرح یہی معاملہ ان کے ساتھ پیش آتا، تو نیاز مندی سے قبول کر لیتے۔ ان کی غزل کا ایک شعر ہے۔

سہ ساقی بھی دورِ جام بھی بادل گہرے ہوئے

اور میرا حال یہ کہ میں توبہ کیے ہوئے

فیض جہنجنہانوی نے اعتراض کیا کہ اس میں ’ایطا‘ کا عیب ہے۔ ماہر صاحب نے اس کی تردید کی اور تحقیق کی کہ ان کا اعتراض بے جا ہے۔ انہوں نے شمس زبیری کی رائے لی جو عروض میں خاصا درک رکھتے تھے، جوش ملیحانی کو بھی خط لکھا ہر جگہ سے ماہر صاحب کی موافقت میں جواب آیا۔ اس کے بعد انہوں

نے بسمل سعیدی کو خط لکھا کہ اپنی رائے سے آگاہ کریں اور دلی میں جو سب سے بڑا عروض داں ہو اس سے دریافت کریں۔ ان کا جواب ماہر صاحب کے حق میں تھا۔ لیکن انہوں نے مطلع تقطیع کے ساتھ اس طرح لکھ کر بھیجا۔

سماسقی ہے ، دور جام ہے ، بادل گھرے ہوئے

اور میرا حال یہ کہ میں توبہ کیے ہوئے

ماہر صاحب نے ان کی اس تصحیح کو ان الفاظ کے ساتھ قبول کیا ” اس طرح میرے مطلع میں ’بھی‘ کی تکرار جو ناگوار تھی ، دور ہوگئی اور اس کی جگہ ’ہے‘ آنے سے شعر کہیں سے کہیں پہنچ گیا۔ یہ ان کی اعلیٰ ظرفی تھی کہ میرے شعر کی کوتاہی کی طرف اپنے خط میں کوئی اشارہ نہیں کیا ، بس شعر لکھ کر بھیج دیا۔ اپنے شعر پر بسمل سعیدی کی اس اصلاح کا اپنے احباب میں بارہا تذکرہ کر چکا ہوں۔“ (بحوالہ ’فاران‘ - نومبر 1977ء)

1927ء مینبداہیوں کے ایک مشاعرے میں ماہر صاحب نے ایک غزل پڑھی جس کا ایک شعر ہے۔

سمہو چکی بیمار الفت کو تسلی ہو چکی

اک نگاہ واپسیں وہ بھی غلط انداز ہے

حضرت احسن مارہروی مشاعرے کے بعد ماہر صاحب کے پاس آئے شاعری کی تعریف کرتے ہوئے اپنے خاص لکنت بھرے انداز میں بولے :

میاں وہ شعر تو پھر پڑھنا جس کا قافیہ ”غلط انداز ہے“ ماہر صاحب لکھتے ہیں ”ان کے اس طرح فرمانے پر میرا ماتھا ٹھنکا کہ میرے اس شعر مینکوئی نہ کوئی خامی ضرور ہے۔ پلک جھپکتے میں ذہن ’نگاہ واپسیں‘ پر پہنچا کہ نگاہ واپسیں تو مرنے والے کی آخری نگاہ کو کہتے ہیں ، میں نے محبوب کی مڑتی ہوئی نگاہ کو ’نگاہ واپسیں‘ کہا ہے ، یہ تو بڑی فاش غلطی ہے ، میں نے قدرے تامل کے بعد شعر پڑھا :

سمہو چکی بیمار الفت کو تسلی ہو چکی

ایک دزدیدہ نظر وہ بھی غلط انداز ہے

مولانا احسن پھر وہاں رُکے نہیں ، عجیب حیرت زدہ انداز میں اپنے خیمے کی طرف بڑھ گئے۔

کراچی میں بھی ایک ایسا ہی واقعہ پیش آیا۔ میں نے ایک ادبی نشست میں اپنی غزل سنائی جس کا ایک شعر یہ تھا۔

سمغنچوں کے دل سے پوچھیے لطف کشادگی

باد صبا پہ تہمت آوارگی سہی

اس پر ایک صاحب نے ”لطف کشادگی“ طنزیہ

انداز میں دہرایا ، میں نے برجستہ دوسری بار مصرعہ اولیٰ یوں پڑھا:

سمغنچوں کے دل سے پوچھئے لطف شگفتگی

ماہر صاحب نے توجہ دلانے پر کمال ہوشیاری سے تصحیح کر لی اور اس کا اعتراف بھی اپنے رسالے فاران میں کیا۔

انہوں نے اپنی تحریروں میں بے شمار ہم عصروں کا ذکر کیا ہے جنہوں نے ان کی تصحیح و تجاویز قبول کر کے اپنے اشعار یا اپنی تحریر میں تبدیلی کر لی تاہم اس قبولیت کو اپنا کارنامہ ظاہر کرنے کے بجائے ان شاعروں یا نثر نگاروں کی عالی ظرفی، خورد نوازی، بے نفسی، اخلاص اور حقیقت پسندی کی دلیل قرار دیا۔ وہ لکھتے ہیں ”پروفیسر محمد الیاس برنی نے ایک بار اپنی نظموں کا مجموعہ بھیجا، تو انہوں نے مرحوم کو لکھا کہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے ’موزوں طبع‘ نہیں بنایا اس لیے ’نظموں‘ کی اشاعت ہمیشہ کے لیے روک دیجیے، یہ بات آپ کے منصب سے فروتر ہے۔ میری اس تنقید کا اور صاف گوئی کا انہوں نے برا نہیں مانا۔“

یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ انہوں نے پاکستان آکر کراچی سے ادبی رسالہ فاران کا آغاز کیا جو ان کی وفات کے کچھ عرصہ بعد تک جاری رہا۔ اس رسالہ میں انہوں نے تمام افراد جو ان کے سامنے دنیا سے کوچ کر گئے اور ان کے حلقہ احباب میں تھے یا ان سے کبھی ان کی ملاقات رہی تھی، پر مضمون لکھے۔ ان میں ادیب، شاعر، سیاستدان اور سماجی کارکن شامل ہیں۔ وفات کے بعد سب کا ذکر بڑی محبت اور تعظیم کے ساتھ کیا ہے۔ لیکن اس میں اکا دکا استثنا بھی ہے، اردو کی آزاد شاعری کے خالق نذر محمد راشد کے انتقال

پر ان کا تبصرہ ان کی ذات اور شاعری پر بڑا جارحانہ تھا۔ وہ لکھتے ہیں ”ن، م راشد نے اردو شاعری میں آزاد نظمیں (بلینک ورس) کہہ کر اردو شاعری کا حلیہ بگاڑ دیا۔ آج جیسی مضحکہ خیز اور پست و بے معنی نظمیں رسالوں میں آرہی ہیں اس کا کریڈٹ نہیں ڈیبٹ (Debit) ن، م راشد کو ملنا چاہیے۔“ مرحوم سے ان کی برگشتگی کی دوسری وجہ ان کی وصیت تھی جس میں ن، م راشد نے اپنے لواحقین کو ہدایت کی تھی کہ ان کی لاش کو دفن کرنے کے بجائے جلایا جائے۔ مرحوم کی بیوی اور بیٹے نے ان کی خواہش کا احترام کیا اور لندن میں اسے جلانے کی رسم ادا کی گئی۔ ماہر صاحب کو ان کا جلایا جانا بڑا ناگوار گزرا اور وہ فرماتے ہیں ”مرتے وقت تو بڑے بڑے منکروں اور آزاد خیالوں

کو توبہ تلا کرتے اور اللہ کی طرف رجوع ہوتے دیکھا گیا ہے۔“ انہوں نے مرحوم شاعر کی آزاد نظم بھی شائع کی ہے اور اسے ”بے سرو پا نظمیں، شاعری، ادب، فکر و خیال اور اظہار و ادا بلکہ اردو زبان کے ساتھ دردناک مذاق قرار دیتے ہوئے لکھا ”ن، م راشد کی بے تکی نظموں نے اردو شاعری کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا ہے۔ خدا کرے اس وبا سے اردو کے شعرا محفوظ رہیں۔“ (بحوالہ فاران دسمبر 1975ء)

ماہر صاحب کی امتیازی صفت اردو کی حفاظت اور زبان و بیان کی درست ادائی



تھی۔ شام ”النور“ کے ایک جلسے کے مخصوص مقرر شورش کشمیری تھے۔ تقریر شروع کرنے کے چند منٹ بعد بولے ”یہ ماہر صاحب لفظ و بیان اور روز مرہ کی غلطیاں پکڑتے رہتے ہیں ۔ فلاں مصرع میں فلاں لفظ کا الف دب گیا -----مضمون نگار نے مذکر لفظ کو مونث کر دیا ----- یہ محاورہ یوں نہیں یوں ہے۔۔۔ اہل زبان اس طرح نہیں بولتے! (ماہنامہ فاران جنوری 1976ء)

شورش کشمیری کے الفاظ بتاتے ہیں کہ ماہر صاحب کی صلاحیت کے وہ بھی معترف تھے۔

زبان اور الفاظ کے معاملے میں ان کی مولانا مودودیؒ سے مراسلت بھی رہی۔  
ماہر القادری کی ایک نمایاں خصوصیت بذلہ سنجی اور فی البدیہہ لطیفہ تخلیق کرنا بھی تھی۔ انہوں نے ایک واقعہ لکھا کہ پاکستان بننے کے بعد لاہور میں انار کلی کے فٹ پاتھ پر ان کی اور ظفر احمد انصاری کی شفیق کوٹی سے ملاقات ہوگئی۔ انہوں نے گھر پر دعوت دی۔ ماہر صاحب نے کہا کہ جگر مرادآبادی ان دنوں لاہور میں ہیں، انہیں بھی دعوت میں بلائیے۔ شفیق کوٹی نے نفی میں جواب دیا اور وجہ یہ بیان کی کہ جب بھی ان سے ملتا ہوں وہ فرماتے ہیں ”تم ریلوے میں نوکر ہو۔“ انہوں نے بار بار تردید کی کہ وہ اسسٹنٹ ڈائریکٹر ہیں، ریلوے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس پر ماہر صاحب نے ان سے پوچھا کہ ان کی ملاقات 1941ء سے پہلے جب وہ بمبئی میں ایک مشاعرے میں آئے تھے۔ پھر کہا ”تو سنئے! میں بھی اب تک یہی سمجھ رہا تھا کہ آپ ریلوے میں ملازم ہیں۔“ اس پر شفیق صاحب بے ساختہ اچھل پڑے، ظفر احمد انصاری بھی ہنسنے لگے۔  
ماہر صاحب کی شاعری کے کئی رنگ ہیں، ایک تو مروجہ یعنی عاشقانہ رنگ اور دوسرا مذہبی رنگ جس میں نعت، حمد اور دیگر کلام شامل ہے۔ اپنی شاعری پر ان کا تبصرہ بھی خوب ہے

ع ہے مرا طرز ناصحانہ ، کہیں مرا طرز عاشقانہ

اس عاشقانہ رنگ میں بھی ان کی انفرادیت محبوب کے شکوہ شکایت کے بجائے اس کی عنایت اور التفات کا اعتراف ہے۔ عبدالکریم عابد اپنی کتاب ”سفر آدھی صدی کا“ میں لکھتے ہیں ”ایک خاص بات یہ ہے کہ ماہر صاحب کے کلام میں محبوب کو عام شعرا کی طرح بے مہر اور ستم گر نہیں کہا گیا ، بلکہ اس کے برعکس وہ کہتے ہیں۔

محمیرے حال پر اور اتنی نوازش  
وہ کیوں مہرباں ہیں خدا کو خبر ہے  
نخشب جارچوی سے ماہر صاحب کے بے تکلفانہ مراسم تھے۔ ان کے انتقال پر لکھے  
ہوئے خاکے میں وہ (ماہر القادری) لکھتے ہیں:  
میں نے اپنی ایک تازہ غزل سنائی تو اس شعر -  
مقتدرہ جب وفا کا ہوتا ہے

میں تمہاری مثال دیتا ہوں

کے بارے میں ایک دن نخشب صاحب بولے ، بھئی تین چار دن سے تمہارے اسی  
شعر میں گم ہوں۔ (ماہنامہ فاران - اکتوبر 1967ء)  
ماہر صاحب کا محبوب کے بارے میں اس طرح کا اظہار خیال دیگر اشعار میں  
بھی کیا گیا ہے۔

محسن والوں کے لطف و کرم دیکھ کر  
سوچتا ہوں میں کیوں پارسا بن گیا  
ہر کسی کا دل نزاکت آشنا ہوتا نہیں  
حسن کا ہر جور ، جورِ ناروا ہوتا نہیں  
دیکھا مری طرف تو وہ شرما کے رہ گئے  
گویا مرا سکوت بھی حاضر جواب ہے  
نگاہِ ناز! ترے حسن التفات کے بعد  
مری طرف سے تغافل کی بھی اجازت ہے

ستم کے بعد ندامت پھر اس کے بعد کرم حضور! اتنے تکلف کی کیا ضرورت ہے  
میں دوسروں کی طرح بدگماں نہیں تجھ سے ترے کہے کا مجھے اعتبار ہے ساقی  
تم آگئے زپے قسمت تمہاری عمر دراز  
تمہارا نام لیا تھا ابھی ابھی میں نے  
ان کا چہرہ مرا نام سن کر  
اور بھی کچھ حسین ہو گیا ہے  
اب آ رہے ہیں ان کی طرف سے پیام شوق حیرت کا ہے مقام مسرت کی بات ہے  
رگِ جاں سے بھی وہ قریب تر ہیں  
مگر یہ فاصلہ بھی کم نہیں ہے  
دوسری طرف وہ محبوب کی جفائوں اور بے نیازی کا تذکرہ ان اشعار میں کرتے  
ہیں:

دلہبی کے ہزار پہلو ہیں  
تم کو لیکن مرا خیال کہاں  
بھولے سے کبھی بزم میں مجھ کو نہ کیا یاد  
یہ بھی بہت ہے آپ کو اتنا تو رہا یاد  
وہ ہنس ہنس کے وعدے کیے جا رہے ہیں  
فریبِ محبت دیے جا رہے ہیں  
ان کے لطف و کرم ہیں اوروں پر  
ہم تو ہیں تہمتیں اٹھانے کو  
اس چشمِ التفات مینرنگِ عتاب ہے  
میری گزارشوں کا یہ پہلا جواب ہے

ناصر کا ذکر توشاعری میں بار بار آیا ہے ، غالباً تمام شاعروں نے اس پر طبع آزمائی کی ہے ۔ تین اشعار ماہر صاحب کے بھی دیکھتے ہیں ۔

سرخدا جانے کب تک ناصر کو میرے

خدا کی طرف سے ہدایت نہ ہو گی

اس قدر تلخ گفتگو ناصر !

تم نے سیکھی ہے بول چال کہاں

آ رہے ہیں وہ حضرت ناصر

اور کچھ الجھنیں بڑھانے کو

ان کے عاشقانہ کلام میں ”جمنا کا کنارہ“ انتہائی مقبول ہوئی ۔ عمر کے آخری دور میں ان سے اس نظم کی فرمائش کی جاتی تو برہم ہو جاتے ۔ وہ کہتے دوسرا کلام بھی ہے ، وہ کیوں نہیں سننا چاہتے ۔ ایک مرتبہ برہمی کے بعد سنانے پر راضی ہو گئے ، تو برہمی کے سبب سے آگاہی ہوئی ۔ یہ نظم انتہائی رومانی ماحول کی عکاسی کرتی ہے جس میں ایک حسینہ کا جمنا کے کنارے آکر اٹکھیلیاں کرنا ، پانی سے کھیلنا بیان کیا گیا ہے ۔

سجامن کے درختوں سے کچھ آگے بڑھا میں

آئی نظر آتی ہوئی اک شوخ دل آرا

اللہ رے ! اٹھلاتی ہوئی چال کی شوخی

رک جائے جسے دیکھ کے بہتا ہوا دھارا

آخری اشعار کچھ یوں ہیں ۔

سے اے بت کدہ ہند کے بے ترشے ہوئے بت

بخشم بہ نگاہ تو سمر قند و بخارا

یک بار بہ این نازیبا بر لب جمنا

یک فرصتِ نظارہ بدہ باز خدارا

ان کی ایک نعتیہ نظم بڑی مشہور ہوئی ، دراصل یہ ایک سلام ہے جس کے اشعار ہیں ۔

سلام اس پر کہ جس نے بے کسوں کی دستگیری کی

سلام اس پر کہ جس نے بادشاہی میں فقری کی

سلام اس پر کہ جس نے خوں کے پیاسوں کو قبائندیں

سلام اس پر کہ اس جس نے گالیاں کہا کر دعائیں دیں

رسولِ مجتبیٰ کہیے ، محمد مصطفیٰ کہیے

خدا کے بعد وہ ہیں پھر اس کے بعد کیا کہیے

جیلانی بی اے نے ماہر صاحب کے انتقال پر تعزیتی مضمون تحریر کیا جو ان کی کتاب ”بہار کے پہلے پھول“ میں شامل ہے ۔ وہ لکھتے ہیں: ”1937ء میں جب یہ (مراد یہ سلام ہے) کتابی شکل میں شائع ہوئی ، تو مناظر احسن جیلانی نے

دیباچہ میں لکھا تھا 'میں پیشین گوئی کرتا ہوں کہ یہ سلام کھٹمنڈو سے لے کر راس کماری تک مشہور ہوگا اور یہ پیشین گوئی حرف بحرف صحیح ثابت ہوئی۔ ان کی ایک معرکتہ الارا نظم "قرآن کی فریاد" بھی انتہائی مقبول ہوئی۔ اس نظم میں قرآن نے اپنی کہانی بیان کی ہے کہ مسلمانوں نے اس کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے ، ہدایت اور عمل کے بجائے اسے ذیلی کاموں کے لیے رکھ چھوڑا ہے۔ اس کا ایک ایک شعر توجہ سے سننے کے قابل ہے۔ پہلا شعر ہے -

سطاقوں میں سجایا جاتا ہوں

آنکھوں سے لگایا جاتا ہوں

تعویذ بنایا جاتا ہوں

دھو دھو کے پلایا جاتا ہوں

اسی طرح کے مظلومانہ اظہار کے بعد آخری شعر میں قرآن کچھ یوں کہتا ہے -

سکس بزم میں میرا ذکر نہیں

کس عرس میں میری دھوم نہیں

پھر بھی میں اکیلا رہتا ہوں

مجھ سا بھی کوئی مظلوم نہیں

اُن کی شاعری سے متعلق بہت کچھ کہا جاسکتا ہے لیکن خود ان کا نکتہ نظر سن لیں -

شعر کہتا ہوں اس طرح ماہر

دل کے کانٹے نکال دیتا ہوں

یوں تو دنیا میں ہر شخص جانے کے لیے آیا ہے۔ اس کے باوجود بہت کم افراد نے اپنی زندگی کا مقصد سمجھا اور اس کے اصولوں کے مطابق زندگی گزاری۔ ماہر القادری بلاشبہ ان لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے امکان بھر رضائے الہی کا حصول اپنے سامنے رکھا۔ یقیناً ان سے غلطیاں بھی ہوئیں ، کوتاہیاں بھی سرزد ہوئیں اور وہ اس پر نادم رہے۔ ان کی وفات اور پھر جنت المعلیٰ میں تدفین پر ان کے دیرینہ ساتھی تابش دہلوی کا کہنا ہے -

ع پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا